ارضِ مقدس پر یہود کے حقِ تملیک کے قرآنی استدلال کا جائزہ

مفتی سمیع الرحمٰن
استاذ جامعہ فاروقیہ، کراچی

یہود کا دعویٰ ہے کہ ارضِ مقدس ان کا قومی وطن ہے، وہ اپنے دعوی کی سچائی کے لیے تاریخی، سیاسی اور سفارتی حکمت عملی کے ساتھ نظریاتی دلائل بھی بروئے کار لاتے ہیں، چونکہ ان کے عزائم میں بڑی رکاوٹ اسلام ہے، اس لیے مسلمانوں کو زیر کرنے کی لیے مصادرِ شرعیہ میں سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، یہود کی یہ فکری خدمت مستشرقین نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ ہمارے برّصغیر میں جو حلقہ مستشرقین کے زیرِ اثر رہ کر ان کے دعاوی کو مقبول بنانے کی سعی میں مصروف ہے، ان کی طرف سے اس دعوی کو تقویت پہنچانے کے لیے قرآن کریم کی دو آیتوں سے بھی استدلال پیش کیا جاتا ہے، ذیل کے مضمون میں انہی استدلالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت فرما کر فلسطین تشریف لائے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے، یہیں ان کے صاحب زادے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پلے بڑھے، جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحب زادے حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں منصبِ اقتدار پر پہنچے تو اپنے پورے خاندان کو جو ستّر افراد کے کنبے پر مشتمل تھا' مصر بلا لیا۔ ۴۳۰ سال تک یہ خاندان مصر میں پھیلتا پھولتا رہا، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان میں پیدا ہوئے اور انہیں مصریوں کی غلامی سے نکال کر صحرائے سینا میں لے آئے، ان کے متروکہ شہر فلسطین پر کافر قوم آباد ہو چکی تھی، اسرائیلیوں کی تعداد تورات کی روایت کے مطابق لاکھوں میں تھی، مگر فلسطین میں بغیر مزاحمت کے نہیں بس سکتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فلسطین کی کافر قوم کے ساتھ قتال فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا، لیکن اسرائیلیوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا، چنانچہ سزا کے طور پر چالیس سال تک ان پر ارضِ مقدس حرام کر دی گئی، یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسی صحرائے سینا میں وصال ہو گیا۔ اس کے بعد

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام کی سرپرستی میں یہودیوں نے قتال فی سبیل اللہ کا فریضہ انجام دیا تو یہ شہر ان کے قبضے میں آ گیا۔ یہودیوں نے اسی بنیاد پر ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ ارضِ مقدس ہماری آبائی سرزمین ہے، ہم اس میں سکونت اور قومی اقتدار کا استحقاق رکھتے ہیں۔ عالمی استعمار کے سہولت کار اور نمائندہ جماعت اقوامِ متحدہ نے اپنی سرپرستی میں ایک قرارداد پاس کی، جس کی روشنی میں ۱۹۴۸ء میں اعلان بالفور کے مطابق دو ریاستی فارمولے کے تحت اسرائیل نامی مملکت وجود میں آ گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کا فلسطین پر اقتدار اور قبضہ کے دعوی کا استحقاق کس بنیاد پر ہے؟ تاریخی بنیاد پر یا مذہبی بنیاد پر؟ اگر تاریخی بنیاد پر ہے تو بھی درست نہیں ہے، تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس شہر کو کنعانیوں اور یبوسیوں نے آباد کیا تھا، چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے رکن عبداللہ بن صالح بن العبید لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ القدس ایک عبرانی شہر ہے، یہ دعویٰ ان تاریخی دستاویزات کو نظر انداز کرنے پر مبنی ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ القدس شہر کے طور پر برونزی عہد کی ابتدا میں آباد ہونا شروع ہوا تھا اور اس کی تعمیر کنعانیوں نے کی تھی۔ آثارِ قدیمہ کے انکشافات اور تاریخی مآخذ کے مطابق فلسطین میں عربوں کی تاریخ ۶/ ہزار سال پرانی ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے فلسطین میں عربوں کا وجود اسرائیلی حملے سے ۲۶۰۰ سال مقدم ہے۔ اس سے یہودیوں کی القدس پر ملکیت کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، حالانکہ قدیم تاریخ کے مطابق یہودیوں کی القدس پر حکومت مسلسل ۷۰ سال سے زیادہ نہیں رہی۔ (ہفت روزہ العالم الاسلامی، خلاصہ، ص: ۱۵ تا ۲۱۔ ۱۹۹۹ء)

اس سے زیادہ عرصہ تو مغل اور افغانستان کے مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان پر اور عرب مسلمانوں نے ہسپانیہ پر حکومت کی ہے۔ اگر ستر سال کی مسلسل حکومت سے ملکیت ثابت ہوتی ہے تو مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ ہندوستان اور ہسپانیہ پر اپنا دعوائے استحقاق جتلائیں، اسے کیوں خاطر میں نہیں لایا جاتا؟ اس دوغلے رویہ پر احتجاج کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟

لیکن یہاں سرِدست اس قرآنی استدلال کا جائزہ لینا ہے جو استشراقی فکر سے متاثرہ حلقے کی طرف سے یہود کے دعوائے استحقاق میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہود کے حقِ تملیک پر قرآنی استدلال کا جائزہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خطاب نقل فرمایا ہے، جس میں آپ نے اپنی قوم کو کہا ہے: ''یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ''... ''اے میری قوم! ارضِ مقدس میں داخل ہوجاؤ جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔'' (اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے کہ: ''پس اللہ تعالیٰ نے ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ '' کے ذریعے یہ مقدس سرزمین یہود کے حق میں مقدّر فرمادی ہے، جس پر اقتدار وسکونت اور تملیک کا ابدی استحقاق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ملا ہے، کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ سرزمین سے ان کو بے دخل کرے۔''

پہلا جواب

جب سے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے، اس وقت سے آج تک کسی صحابیؓ، تابعی، مفسر، محدث، مجتہد نے ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ '' سے یہ مراد سمجھی ہے، نہ یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ اس سے یہود کی مقدس سرزمین پر ابدی حقِ تملیک ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ مراد اتنی واضح تھی تو سلفِ صالحین اس پر کلام فرماتے اور حضور ﷺ مدینہ سے جلاوطن کردہ یہودیوں کو ان کی آبائی استحقاقی سرزمین یاد دلاتے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارضِ مقدس کو فتح کرنے کے بعد اس آیت پر عمل کرتے ہوئے دربدر بھٹکتے یہودیوں کو یہ سرزمین حوالہ کرکے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتے، لیکن اس آبائی حقِ تملیک پر نہ آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا، نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غلبہ پاکر یہ سرزمین یہودیوں کے حوالہ کی، نہ کسی صحابیؓ نے انہیں قرآنی آیت سنا کر یہ حکمِ الٰہی یاد دلایا۔ یہ نادر خیال اور استدلال آیا تو صرف اور صرف استشراقی فکر سے فیض یاب ہونے والے محققین کو آیا۔

دوسرا جواب

قرآن کریم میں ''كَتَبَ '' کا لفظ کئی معنی میں آیا ہے:

۱- ''كَتَبَ '' بمعنی ''قَضٰی '' فیصلہ کرنا، (جیسے ''كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ '' (تفسیر طبری، المجادلۃ، ذیل آیت: ۲۱)

۲- ''كَتَبَ '' بمعنی ''أمر '' (تفسیر طبری، المائدۃ، ذیل آیت: ۲۱)

۳- ''كَتَبَ '' بمعنی ''وعد '' (تفسیر ابن کثیر، المائدۃ، ذیل آیت: ۲۱)

۴- ''كَتَبَ '' بمعنی ''وهب '' (تفسیر طبری، المائدۃ، ذیل آیت: ۲۱)

۵-''كَتَبَ''یعنی''كتب في اللوح المحفوظ''(تفسیر الآلوسی، ذیل آیت:۲۱)

۶-''كَتَبَ''یعنی''قدّرها وقسمها لكم''(تفسیر الآلوسی، ذیل آیت:۲۱)

ان معانی میں سے کوئی ایک معنی بھی ابدی حق تملیک اور دائمی حق استقرار پر دلالت نہیں کرتا،''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' کے ذریعے جو وعدہ یہود سے کیا گیا تھا، اس وعدہ کی تکمیل ایک مرتبہ یہود کے ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے پوری ہوجاتی ہے، چنانچہ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ نکتۂ اعتراض اٹھایا کہ جب ''فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ'' کے ذریعے ارضِ مقدس یہود پر حرام کردی گئی ہے تو پھر لوحِ محفوظ میں لکھا کیسے ثابت ہوگا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:''اسرائیلیوں کے لیے جو مقامِ سکونت مقدر میں لکھا گیا تھا، وہ بعد میں ارضِ مقدس میں داخل ہونے اور اسے جائے سکونت بنانے سے پورا ہوگیا۔''(اس میں تسلسل اور دوام کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہونا دلیلِ ابدیت نہیں ہے)۔

مزید برآں لوحِ محفوظ کے مندرجات میں تغیّر وتبدل جاری رہتا ہے، محض مقدّر اور لوحِ محفوظ میں درج ہونے سے کسی امر کو دوام وابدیت کی دلیل نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:''لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوْا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ''(الرعد:۳۸،۳۹)''ہر ایک وعدہ ہے لکھا ہوا، مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے، اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب۔''

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے آپ دورانِ طواف روتے ہوئے دعا کرتے تھے:

''اللّٰهم إن كُنْتَ كَتَبْتَنِي في أهل السعادة فأثبتني فيها، وإن كنت كتبتني في أهل الشقاوة والذنب فامحُني وأثبتني في أهل السعادة والمغفرة، فإنّك تمحو ما تشاء وتثبت وعندك أمّ الكتاب.''

''اے اللہ! اگر آپ نے مجھے (لوحِ محفوظ میں) اہلِ سعادت میں لکھ رکھا ہے تو اسے ثابت رکھیے اور اگر آپ نے مجھے (لوحِ محفوظ میں) بد بخت اور گناہگاروں میں لکھا ہے تو یہ لکھا مٹا دیجئے اور اہلِ سعادت و مغفرت میں ٹھہرا دیجئے، بے شک آپ جو چاہتے ہیں مٹاتے ہیں اور جسے چاہے ثابت رکھتے ہیں اور آپ ہی کے پاس لوحِ محفوظ ہے۔''(تفسیر القرطبی، الرعد، ذیل آیت:۳۹)

اسی طرح کی دعا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ نے ایک خاتون کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

''اللّٰهم إن كان في بطنها جارية فأبدلها غلامًا، فإنّك تمحو ما تشاء و تثبت و عندك أم الكتاب.''

''اے اللہ! اگر اس کے پیٹ میں لڑکی ہے تو اسے لڑکے سے بدل دے، بے شک تو مٹاتا ہے اور

باقی رکھتا ہے اور آپ کے پاس ہی لوحِ محفوظ ہے۔'' (تفسیر القرطبی، الرعد، ذیل آیت: ۳۹)

لہٰذا معلوم ہوا کہ محض لوحِ محفوظ میں لکھے جانے سے کسی چیز کا دوام ثابت نہیں ہوتا اور لوحِ محفوظ کے مندرجات میں تغیّر وتبدل بھی رہتا ہے، ہاں! علمِ الٰہی ازل سے اور ابد تک تغیّر وتبدل سے پاک اور محفوظ ہے۔

تیسرا جواب

اگر ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' کی بنا پر ارضِ مقدس یہود کے حق میں مقدّر ہو چکی تھی تو پھر ''فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ'' کے ذریعے چالیس سال تک یہود کو ان کے حق سے کیوں محروم کر دیا گیا؟ اس کے جواب میں استشراقی حلقۂ فکر کے احباب کہتے ہیں: محرومیت کی یہ مدّت محدود تھی، حالانکہ سوال یہ نہیں کہ محرومیت کی مدّت محدود تھی یا غیر محدود؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ مقدّر میں لکھے حکم سے محروم کیا ہی کیوں کیا گیا؟

اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے انہیں ارضِ مقدس سے محروم کر دیا گیا، کیونکہ جب انہوں نے قتال کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا: ''فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ ازلی کی بنا پر اطلاع فرما دی کہ چالیس سال کے بعد اسرائیلی قتال کا حکم بجالا کر ارضِ مقدس میں سکونت اختیار کریں گے، تب تک ارضِ مقدس سے محروم رہیں گے، چنانچہ چالیس سال کے بعد جب اسرائیلی حکمِ الٰہی بجالائے، تب ارضِ مقدس کے فاتح بنے۔ محض چالیس سال کی دربدری کی مدت مکمل کرنے سے ارضِ مقدس کے مالک نہیں بنے، گویا ارضِ مقدس کا انعام اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کے ساتھ مشروط تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زبور کا حوالہ دے کر فرمایا ہے کہ ارضِ مقدس کی وراثت کا استحقاق اپنے نیک بندوں کو بخشا ہے: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ'' (الانبیاء: ۱۰۵) ترجمہ: ''اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے۔''

یہود نے جس طرح قتال فی سبیل اللہ کا انکار کر کے اپنے استحقاق کو ختم کر دیا تھا اور چالیس سال کے بعد قتال کا حکم بجالا کر ارضِ مقدس کے مالک بنے تھے، اسی طرح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کر کے ارضِ مقدس کے اعزازی استحقاق سے محروم ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی وجہ سے یہ امتِ کافرہ بن چکی ہے اور ارضِ مقدس سے ان کی محرومی مندرجہ بالا نص سے ثابت ہے۔ اس استدلال کو قیاسی بتلانا صریح مغالطہ ہے۔ یہود کے ابدی استحقاق پر کوئی صریح نص نہیں ہے، مگر بالفرض اسے تسلیم کر بھی لیا جائے تو ان کے عزلِ استحقاق پر صریح نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو محض اس لیے اعزاز واکرام سے نوازے کہ وہ برگزیدہ لوگوں کی اولاد ہے۔ سنتِ الٰہیہ میں اعزاز واکرام کے وعدے ایمان کی بنیاد پر ہوتے ہیں، نیز ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' کے ذریعے امرِ تکوینی کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ یہود

کے لیے امرِ تشریعی نہیں ہے کہ وہ کفر کی حالت میں بھی اس سرزمین کو حاصل کرنے کے مکلف ہوں، کیونکہ ''کَتَبَ'' امرِ تشریعی کے لیے اس وقت ہوتا ہے جب اس کے صلہ میں ''عَلٰی'' ہو، جیسے ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ'' (فرض کیا گیا تم پر روزہ) (البقرۃ:۱۸۳) ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ'' (فرض ہوئی تم پر لڑائی) (البقرۃ:۲۱۶) بالفرض امرِ تشریعی مان لیا جائے، تب بھی یہ قابلِ استدلال نہیں، کیونکہ شریعتِ محمدیہ شریعتِ موسویہ کے لیے ناسخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

چوتھا جواب

اللہ تعالیٰ نے حصولِ اولاد کے لیے فرمایا: ''وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ'' (اس اولاد کی کوشش کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے، لیکن اس مقدر کے لکھے کو حاصل کرنے کے لیے تشریعی امور کا التزام ضروری ہے، وہ ہے شرعی نکاح کرنا جو دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص امرِ تکوینی سے استدلال کرتے ہوئے کسی اجنبیہ سے حصولِ اولاد کی کوشش کرے گا تو اس کی قسمت میں کوڑے اور سنگساری کی سزا ہے، اسی طرح یہود کے لیے ''کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ'' سے ارضِ مقدس کا حصول' ایمان اور عملِ صالح کے تشریعی امور کے اہتمام پر موقوف ہے، اگر یہود محض امرِ تکوین سے استدلال کر کے ارضِ مقدس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کی قسمت میں ذلت ومسکنت کے عذاب کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دیتے ہوئے فرمایا: ''وَضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ ۞ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ط''

یہود کی شامتِ اعمال سے جب رومی حملہ آور طیطوس (ٹائی ٹس) نے ارضِ مقدس پر حملہ کر کے یہود کو جلاوطن کر دیا، اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا'' (اگر تم پھر کفر وعصیان کی روش پر لوٹ آئے تو ہم تمہیں اسی طرح پھر عذاب میں دوچار کریں گے۔) یہود نے ان واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا، محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان کی بجائے تکذیب اور مخالفت پر اُتر آئے، اس لیے امّتِ محمدیہ ان کے لیے قہرِ الٰہی بن کر نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے ذریعے بھی کافروں کو عذاب دیتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ'' (التوبۃ:۱۴) ''لڑو ان سے، تاکہ عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے۔'' پس یہود کا کفر وعصیان ارضِ مقدس سے محروم ہونے کی بنیاد ہے اور اس سے ان کو بے دخل کیا جانا وعدۂ الٰہی کا تقاضا ہے، جس کی تکمیل تشریعی طور پر اہلِ ایمان کے ذمہ ہے۔

پانچواں جواب

اگر ارضِ مقدس پر یہود کا ابدی استحقاق ہوتا تو پھر شام کی کنجیاں حضور ﷺ کو نہ دی جاتیں، اللہ تعالیٰ

نے وہ کنجیاں حضور ﷺ کو دے کر اس کا مالک امّتِ محمدیہ کو بنادیا، چنانچہ عہدِ فاروقی میں اس سرزمین نے مسلمانوں کے فاتحانہ قدموں کا استقبال کیا۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ غزوۂ خندق (کی کھدائی) کے موقع پر ایک سخت چٹان آڑے آگئی، جس پر کدال اچٹ جاتی اور چٹان ٹوٹتی نہ تھی، ہم نے آپ سے شکوہ کیا، آپ ﷺ تشریف لائے، کدال لی اور بسم اللہ کہہ کر ایک ضرب لگائی (تو ایک ٹکڑا ٹوٹ گیا) اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے ملکِ شام کی کنجیاں دی گئی ہیں، واللہ! میں اس وقت وہاں کے سنہرے محلوں کو دیکھ رہا ہوں۔'' یہ بشارت عہدِ فاروقی میں مکمل ہوئی، قرآن وسنت کی ان نصوص کو نظر انداز کر کے کتابِ مقدس کے محرفہ مندرجات کو سامنے رکھ کر یہود کے دعوائے استحقاق کی فکری عمارت کھڑی کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسرے استدلال پر ایک نظر

ارضِ مقدس پر قومِ یہود کے حقِ تملیک کے لیے دوسرا استدلال اس آیتِ کریمہ سے پیش کیا جاتا ہے:

''وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ط'' (الاعراف:۱۳۷)

''اور وارث کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے مشرق اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے۔''

آیتِ کریمہ کے لفظِ وراثت سے یہود کے دعوائے حقِ تملیک کا استدلال کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ لفظ آیتِ کریمہ میں فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوا، بلکہ یہ تعبیر محض عطاء الٰہی اور بلا مشقت نوازنے کے لیے استعمال ہوئی ہے، اس لفظ سے ابدی حقِ تملیک کی نکتہ آفرینی درست نہیں ہے، کیونکہ یہی لفظ فرعون کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جسے اللہ نے ارضِ مصر کی وراثت سے نوازا تھا، پھر اس سے چھین بھی لی تھی، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرعون کے ظلم وستم پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۗ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ'' (الاعراف:۱۲۸)

''موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے فرمایا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، ساری زمین اللہ کی ملکیت میں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بنادیتا ہے اور اچھا انجام ایمان والوں کا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے امرِ تکوینی سے دنیاوی جاہ ومنصب سے جسے چاہے نوازتا رہتا ہے، خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن، ہاں حسنِ انجام صرف اہلِ ایمان کا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف اقتدار کے تکوینی ہونے کی طرف اشارہ فرمایا اور دوسری طرف اسرائیلیوں کو اُمید دلائی کہ یہ تکوینی فیصلہ تمہارے حق میں بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تمہیں اس کا وارث بنا کر اس کا اقتدار تم میں بھی منتقل کرسکتا ہے۔

چنانچہ سورۂ اعراف کی آیتِ کریمہ ''وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ط'' (الاعراف:۱۳۷) میں اور سورۂ دخان کی آیتِ کریمہ ''وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ'' (الدخان:۲۸) میں اسی انتقالِ وراثت کا اعلان ہے۔ وراثت کا لفظ تو تبدیلیِ ملک پر دلالت کرتا ہے، چہ جائیکہ اس سے کسی قوم کی ابدی ملکیت کا حق ثابت ہو۔

نیز اگر حقِ ملکیت فرض کر بھی لیا جائے تو یہود کے لیے ارضِ مقدس کا استحقاق ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ مشروط تھا۔ قرآنی بیان کے مطابق یہ شرط زبور میں بیان کی گئی تھی:

''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ'' (الانبیاء:۱۰۵)

''اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے۔''

یہود نے حضور ﷺ کی رسالت کو جھٹلایا اور آپ کی جان کے درپے رہے، آپ سے دشمنی رکھی، یہود کے یہ سارے کفریہ اعمال ان کو ارضِ مقدس کے اعزازی استحقاق سے محروم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد واضح ہوا کہ ان دو آیات میں کسی بھی طرح یہود کا حقِ تملیک ثابت نہیں ہوتا، ہاں! یہود کے لیے یہ مقامِ فرحت ضرور ہوگا ان کے من کی بات اُن سے بہتر طریقے سے کرنے والے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو چکے ہیں، فَإِلَى اللهِ الْمُشْتَكٰى۔

غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم
اے جانِ وفا! یہ ظلم نہ کر